

حسن عسکری کے پاکستانی ادب کے تصورات Hassan Askari's concepts of Pakistani literature

¹ ڈاکٹر غلام عباس

Abstract:

Muhammad Hassan Askari's views about Islamic/Pakistani Literature and Culture: A Critical Review. Hassan Askari holds a key position in Urdu literature. He cannot be ignored in criticism as well. His scope of criticism is noteworthy. He wrote intensively and extensively about Islamic and Pakistani literature before and after the creation of Pakistan. He believed that Pakistan would be the first republic and socialist state in subcontinent. That's why he considered Pakistan beneficial not only for the Pakistanis but also for the Hindus. He gave no place to hypocrisy in Islamic literature. He is the first scholar who originated debate to determine the pros and cons of Pakistani literature and Pakistani culture. Many great scholars of Urdu like Faiz Ahmad Faiz, Ahmad Nadeem Qasmi and Intizar Hussain along with other progressive critics played their roles in the projection and propagation of these debates. In this article, review of Askari's such views have been presented.

Keywords: Nativeness, Local culture, Mysticism, Environment, Regional life, Social Behavior

اسلامی/پاکستانی ادب اور ثقافت کے بارے میں محمد حسن عسکری کے خیالات: ایک تنقیدی جائزہ۔ حسن عسکری کو اردو ادب میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ تنقید میں بھی اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی تنقید کا دائرہ قابل توجہ ہے۔ انہوں نے قیام پاکستان سے پہلے اور بعد میں اسلامی اور پاکستانی ادب کے بارے میں گہرا اور وسیع لکھا۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان برصغیر کی پہلی جمہوریہ اور سوشلسٹ ریاست بنو گی۔ اسی لیے وہ پاکستان کو نہ صرف پاکستانیوں کے لیے بلکہ ہندوؤں کے لیے بھی فائدہ مند سمجھتے تھے۔ انہوں نے اسلامی ادب میں منافقت کو کوئی جگہ نہیں دی۔ وہ پہلے اسکالر ہیں جنہوں نے پاکستانی ادب اور پاکستانی ثقافت کے فائدے اور نقصانات کا تعین کرنے کے لیے بحث کا آغاز کیا۔ اردو کے بہت سے بڑے اسکالر جیسے فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی اور انتظار حسین نے دیگر ترقی پسند نقادوں کے ساتھ ان مباحثوں کی ترویج و اشاعت میں اپنا کردار ادا کیا۔ اس مضمون میں عسکری کے ایسے خیالات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

کلیدی الفاظ: حسن عسکری، مقامیت، پاکستانی ادب، اسلامی ادب، عمومی رویے

پروفیسر محمد حسن عسکری (بلند شہر ۱۹۲۱ء تا ۱۹۷۸ء کراچی) کا شمار اپنے عہد کی نابھہ روزگار شخصیات میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اردو ادب بالخصوص اردو تنقید کو ایک نیا انداز اور ایک نیا معیار عطا کیا۔ وہ اردو کے ایک عظیم نقاد ہیں جنہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے ادیبوں اور ناقدین کے ایک بڑے حلقے کو متاثر کیا۔

^۱ استاد، شعبہ اردو، گورنمنٹ گریجویٹ کالج، تونسہ

عسکری صاحب کے تنقیدی موضوعات کا پھیلاؤ دیدنی ہے: تہذیبی مسائل ہوں یا تصوف، شاعری ہو یا افسانوی ادب، مصوری ہو یا موسیقی، فن تعمیر ہو یا فلم اور فوٹو گرافی، عسکری صاحب کا زیرک ذہن ہمیشہ نئے مباحث پیدا کرتا رہا ہے اور یوں ایک پوری نسل کو ادب کے بارے میں نئی معلومات فراہم کیں۔ اور آج ان کی وفات کے ریل صدی بعد بھی ان کے تنقیدی خیالات پر بحث و تحقیق کا سلسلہ جاری ہے۔

تقسیم ہند (قیام پاکستان) انسانیت کا المیہ کہیے یا انسانوں کی ضرورت ایک حقیقت تو ماننی پڑتی ہے؛ اس سے کچھ عرصہ قبل ہی عسکری صاحب، مسلم لیگ اور قائد اعظم (جناح صاحب) کی قیادت کو عوامی تقاضے کے طور پر تسلیم کیا، ان کی وکالت کی اور ادیبوں کی حد تک بڑے واضح طور پر پاکستان کو قبول کرنے کے حق میں سامنے آئے۔ آپ تو اس قدر پر جوش ہیں کہ انھیں یہ یقین ہو چلا ہے کہ اس وقت چونکہ ”مسلم لیگ ہر قسم کی استعماریت استبداد اور سرمایہ داری کی مخالفت کر رہی ہے۔“ اور وہ ”عوامی اور جمہوری“ جماعت ہے۔ اس جماعت کا ”پاکستان براعظم ہندوستان میں سب سے پہلی عوامی اور اشتراکی ریاست ہو گا۔“ اسی لیے وہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کا قیام نہ صرف مسلمانوں کے لیے فائدہ مند ہو گا بلکہ خود ہندو عوام کے لیے بھی سودمند ثابت ہو گا۔ اور بہت کھلے لفظوں میں وہ اعلان کرتے ہیں:

”چونکہ دنیا سے سرمایہ داری کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے اور مستقل امن وامان قائم کرنے میں پاکستان سے بہت مدد ملے گی۔ اس لیے میں مسلم لیگ سے متعلق ہونا فخر کی بات سمجھتا ہوں۔“ [۱]

لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ ادب کے بارے میں مسلم لیگ سے کسی طور پر سمجھوتا نہیں ہو گا۔ وہ جناح کو ایک کھرا سچا بے باک سیاسی راہنما مانتے ہوئے بھی اسے شیکسپیر کی عزت و عظمت دینے کے قطعی مخالف ہیں۔

عسکری صاحب بہت پر امید ہیں اور سوچتے ہیں کہ مسلمان ادیبوں کے لیے پاکستان کیسی بڑی نعمت ہو گا۔ پاکستان میں مسلمان ادیب کو اپنی ذمہ داری کا زیادہ احساس ہو گا اور وہ عوام سے زیادہ یگانگت بھی محسوس

کرے گا۔ اس کا رابطہ اپنے عوام سے زیادہ براہ راست ہو گا۔ غرض یہ کہ پاکستان اردو ادب کو ایک نئی زندگی بخشنے کا اور اس میں زندہ قوموں کا لب و لہجہ پیدا ہو سکے گا۔

قیام پاکستان کے بعد جب انھوں نے پاکستانی ادیبوں سے پاکستانی یا اسلامی ادب پیدا کرنے کا مطالبہ کیا تو بڑے شفاف الفاظ میں کہتے سنائی دی ہے:

”پاکستانی یا اسلامی ادب کی پہلی شرط یہ ہے کہ اس میں ریاکاری کو مطلق دخل نہ ہو۔ اگر آپ اسلام کے کسی اصول پر ایمان نہ لاسکے تو اپنے افسانے یا نظم میں اپنا پورا ذہنی اور روحانی تجربہ پیش کیجئے کہ فلاں فلاں نفسیاتی محرکات مجھے ایمان نہیں لانے دیتے۔“ [۲]

عسکری صاحب کو جب اسلامی ادب کے طور پر زیر بحث لایا جاتا ہے تو عموماً سمجھ یہ لیا جاتا ہے کہ جماعت اسلامی اور عسکری کا اسلامی ادب ایک ہی چیز ہے۔ ایسا ہر گز نہیں جس طرح آپ ترقی پسندوں یا مارکس کے خلاف ہوتے ہوئے بھی آپ مارکسی فلسفے کی اہمیت کا اعتراف کرنے میں جھجکتے نہیں ہیں اسی طرح جماعت اسلامی کے محدود نظریے کی حمایت تو درکنار بلکہ کھلی مخالفت بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ اپنے ایک مضمون ”پاکستانی ادب“ میں باقاعدہ نام لیتے ہوئے ذکر کرتے ہیں اسی مضمون سے چند سطریں مقتبس کی جاتی ہیں:

”پاکستان میں تو شخصی آزادی کو ایسے گروہوں سے بھی خطرہ لاحق ہے جو سرے سے معاشی انصاف کے قائل ہی نہیں۔ مثلاً شرعی نظام کا نام لینے والے گروہ جن میں مودودی گروہ پیش پیش ہیں۔ یہ گروہ ایسا عجیب ہے کہ ایک ہی سانس میں معاشی انصاف کا مطالبہ بھی کرتا ہے (خصوصاً جب پاکستان کی حکومت کے خلاف لوگوں کو بھڑکانا منظور ہو) اور پھر اس مطالبہ سے بے تعلق بھی ہو جاتا ہے۔ جب حکومت اس گروہ کے اخباروں پر پابندی لگائے تو فوراً جمہوری اصولوں کی دہائی دی جاتی ہے اور جب دوسرے لوگوں کی آزادی رائے کا مسئلہ درپیش ہو تو یہی لوگ بدترین قسم کے فسطائی بن جاتے ہیں۔ یہ ایسی جماعت ہے جس کے پچندے میں نیم تعلیم یافتہ قسم کے لوگ بڑی جلدی آ جاتے ہیں، اس لیے اس کے پھیلائے

ہوئے رجحانات بڑے مہلک ہیں۔ ایسے فنون کا مقابلہ بھی حکومت نہیں، ادیب ہی کر سکتے

ہیں۔“ [۳]

عسکری صاحب کے ادبی و تنقیدی تصورات کی تفہیم سے ہر کسی نے اپنے سمجھ اور صلاحیت کے نتائج اخذ کیے ہیں انھیں کئی ایک الزام کا سامنا ہا مثلاً بعضوں نے انھیں فراری، داخلیت پسند، زندگی سے گریزاں اور زوال پسند انحطاطی ثابت کرنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی لیکن عسکری صاحب کے مضامین گہرائی سے پڑھنے میں واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے انفرادی اور اجتماعی زندگی، تاریخی شعور، تہذیب و کلچر یا اپنے زمانے کے کسی بھی مسئلہ سے آنکھیں نہیں چرائیں۔ بلکہ دوسروں سے پہلے آگے آگے آپ ہی ہوتے ہیں۔ صرف خود ہی اس مسئلہ پر لکھنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اپنے دوسرے ادیب ساتھیوں کو بھی اپنے زمانے کے اہم ترین مسائل اور بالخصوص برصغیر کے مسلمانوں کے قومی شعور سے آگاہی کی طرف بلاتے نظر آتے ہیں۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد عسکری صاحب آزادی اظہار رائے کی بات کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن اس سے آگے وہ اس نئے ملک کے لیے کلچر یعنی پاکستانی کلچر اور پاکستانی ادب کی ضرورت اور اس کے خدو خال متعین کرنے کی بحثیں بڑی شد و مد سے اٹھاتے ہیں۔ یوں تو کلچر، تہذیب پر اور ادیب بھی لکھنے میں سرگرم ہیں لیکن عسکری کے آواز کو دور سے سنا جاسکتا ہے عسکری صاحب نے پاکستانی کلچر کی تشکیل کے حوالے سے اس بات پر بڑا زور دیا کہ ہمارا کلچر نیا نہیں ہے بلکہ صدیوں کی روایت رکھتا ہے۔ لیکن بعض لوگوں کو اس ضمن میں غلط فہمیاں ہیں اور وہ صرف اپنے ”اسلامی“ کلچر کے قائل ہیں۔ مسلمانوں کے تمدن نے مختلف ملکوں اور قوموں اور مختلف زمانوں میں جو چار شکلیں اختیار کیں انھیں یہ لوگ کوئی اہمیت نہیں دیتے بلکہ اسے اصل اسلام سے انحراف سمجھتے ہیں حالانکہ اسلام نے شعوری طور پر نسلی اور قومی حد بندیوں کو توڑا لیکن یہ لوگ اسلام کو محض عربوں سے منسلک کر دیتے ہیں اور اسلامی کلچر کو عربوں کا کلچر سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہر معاملے میں سند صرف ”خلافت راشدہ“ کا زمانہ ہے۔ اب جو کہ پاکستان کے قیام کا مقصد کلچر کا تحفظ ہے اس لیے ان لوگوں کا مطالبہ ہے کہ ”پاکستان کو محض روح کے اعتبار سے نہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی خلافت راشدہ کا نمونہ

بنایا جائے۔“ [۴] یہاں تک کہ پاکستان کی قومی زبان بھی عربی ہونی چاہیے اور کچھ تو عربی لباس تک کی باتیں کر رہے ہیں۔ المیہ ان کا یہ ہے کہ ظاہری شکل و صورت تو بالکل ”اسلامی“ بنانا چاہتے ہیں مگر معاشی نظام میں کسی تبدیلی کا ذکر پسند نہیں کرتے اور نہ جمہوری قسم کے سیاسی اداروں کے قائل ہیں اور ان کے ثقافتی نظریات تو کھلم کھلا عوام کے مفاد کے خلاف ہیں۔ اسلامی کلچر کا ایسا تنگ دلانہ نظریہ خود اسلام کی روح کے منافی ہے۔ اسلام اپنے پیروؤں کو کلچری معاملات میں تو آزادی دینے والا دین ہے۔ دوسرے کلچروں سے استفادہ کی ممانعت بھی نہیں ہے۔ یہ تو سامنے کی بات ہے کہ اسلام جس ملک میں گیا وہاں سے اس نے کئی ایک چیزیں مستعار لی ہیں۔

عسکری صاحب کہتے ہیں کہ اسلام کے بنیادی تصورات کے بعد ایک اور کلچری تصور ہے جس کا پاکستان کے کلچر پر سب سے زیادہ حق ہے وہ ہے ”ہند اسلامی کلچر“ عمومی اعتبار سے یہ وہ کلچر ہے جو دہلی کے مسلمان سلطنتوں کے زیر سایہ نشوونما پاتا رہا ہے اور ان کے بڑے مظاہر میں ”مغل عمارتیں“ اور ”اردو زبان“ آتی ہے۔ براعظم ہندوستان کے مسلمانوں نے جذباتی اعتبار سے اپنے آپ کو دہلی کے مغل سلطنت سے ہمیشہ متعلق سمجھا ہے۔ اور اسی تعلق کی بنا پر وہ اپنے آپ کو ایک وحدت تصور کرتے رہے ہیں اسی وحدت کے تحفظ اور استحکام کی فکر تھی جس نے مدارس، بنگال، پنجاب اور یوپی کے مسلمانوں سے پاکستان کے حق میں رائے دلائی اور اس حمایت میں وہ اپنا نفع نقصان بھول گئے۔ بلکہ اس کی حمایت کی قیمت انھوں نے اپنی جان و مال اور عزت و آبرو سے ادا کی چنانچہ ”ہند اسلامی کلچر سے پاکستان غفلت برت ہی نہیں سکتا“ کیونکہ یہ تو ہمارے لیے ایک مقدس امانت کی حیثیت رکھتا ہے پاکستان کے کلچر میں ہند اسلامی کلچر کی بنیادی حیثیت اجاگر کرنے کے لیے عسکری صاحب کچھ یوں خامہ فرسائی کرتے ہیں:

”پاکستان میں ہمیں بہت سی نئی ضرورتیں پیش آئیں گی جن کے لیے ہمیں نئی کلچری اوضاع

ایجاد کرنی پڑیں گی مگر ہند اسلامی تہذیب کا بنیادی خاکہ ہمارے پاس موجود ہے اور ہماری

کلچری عمارت اسی کے اوپر تعمیر ہونی چاہیے مگر یہ بھی ناممکن ہے کہ پاکستان کا کلچر لفظ بہ لفظ

وہی ہو جو دہلی و لکھنؤ کا کلچر تھا۔ ایک مطلق العنان بادشاہی اور جمہوری ریاست میں فرق ہونا ہی چاہیے۔ اس زبردست کلچری اختلاف کی وجہ سے ہندو اسلامی کلچر کی ایک روایت اور اس میں ایک تسلسل بھی باقی رہے گا اور جمود بھی پیدا نہیں ہوگا، ہم تجربہ کی بے راہ روی سے بھی بچ جائیں گے اور لکیر کے فقیر بھی نہیں بن رہیں گے۔“ [۵]

عسکری صاحب کا کہنا ہے کہ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ مقامی کلچر کو بالکل ختم کر دیا جائے وہ بھی اپنی اپنی جگہ زندہ رہنا چاہیے بلکہ قومی کلچر کی تعمیر میں مقامی کلچر کا ایک زبردست حصہ ہوگا اور اس نئے عنصر کی وجہ سے ہندو اسلامی کلچر کی روایت کو تازگی اور توانائی ملے گی ہمارا کلچر ہمارا ادب ہماری زبان پاکستان کے مختلف صوبوں سے نئے نئے طور طریقے نئی فضا نہیں روح حاصل کریں گے۔ جہاں تک مغربی کلچر کی بات آتی ہے تو عسکری صاحب کہتے ہیں ہم اس سے بھی قطع تعلق نہیں ہو سکتے آج کے دور میں کوئی معاشرہ دوسروں سے قطع تعلق کر کے رہ ہی نہیں سکتا کیونکہ آج کل ایسی کلچری ضرورتیں ہیں جو کسی ایک خاص ملک تک محدود نہیں ہے بلکہ عالمگیر ہیں اس لیے خود مغرب بھی مشرق کے اثرات سے باہر نہیں ہے۔

تو ہم تو مغرب کے اثرات لیے بغیر کیسے رہ سکتے ہیں اور ادب کے میدان میں تو ہم مغرب سے بے تعلق ہو ہی نہیں سکتے وہ کہتے ہیں کہ ادب ہزار قومی اور نسلی چیز ہو لیکن اس کے اثرات اب بین الاقوامی ہوتے جا رہے ہیں اردو افسانے میں صرف نذیر احمد اور سرشار ہی نہیں بلکہ موپساں اور چیخوف بھی ہماری روایت کا حصہ ہو چکے ہیں۔ خود اسلامی تہذیبوں کی روایت کو ہم دوسری کلچری روایتوں سے مقابلہ موازنہ کئے بغیر نہیں سمجھ سکتے اور پھر اسلامی تہذیب کی روایت کو ترقی دینے کا بھی یہی ایک ذریعہ ہے کہ دنیا کی دوسری تہذیبوں سے آنکھ نہ چرائی جائے۔ آخری بات یہ ہے کہ ہمیں بنیادی اصول تو ضرور عزیز ہونے چاہیے مگر خارجی اثرات سے گھبرانا ہمارے لیے مہلک ہوگا۔ پاکستان کا کلچر تو ایسا ہونا چاہئے جو بیک وقت مقامی بھی ہو اسلامی بھی ہو اور عالمگیر بھی ہو۔

آپ کلچر کے ثانوی اقدار پر تو آزادی رائے زیادہ ضروری سمجھتے ہیں لیکن بنیادی اقدار پر کسی شک و شبہ کی اجازت دینے کے خواہاں نہیں ہیں۔ اس بیان کو بڑا فسطائیت پرور سمجھتے ہوئے بھی ضروری قرار دیتے ہیں کیونکہ اگر کسی معاشرے کو زندہ رہنا ہے تو کچھ باتوں پر جبر سے کام لینا ہی پڑتا ہے۔ وہ مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ روس کو ہی دیکھ لیجیے وہاں کے معاشرے کا سب سے بنیادی عقیدہ ”معاشی انصاف“ ہے تو روس ہر بات پر آزادی رائے دے سکتا ہے مگر یہ حق کسی کو نہیں دے گا کہ کوئی کہتا پھرے کہ انصاف غیر ضروری چیز ہے۔ عسکری کا کہنا ہے کہ اتنی فسطائیت برتے بغیر روس زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح ہمیں پاکستان کے لیے بھی کچھ چیزوں کو ”ناقابل بحث“ سمجھنا ہو گا ورنہ پاکستان کا قیام ہی خطرے سے دوچار ہو جائے گا ہاں یہ ضرور ہے کہ ان بنیادی عقیدوں کے خارجی مظاہر پر زیادہ سے زیادہ غور و فکر ہونا چاہیے اس پر بات ہونا مستحسن قدم ہو گا:

”ہمارے قومی اور تہذیبی استحکام کے بہترین شہادت یہ ہو گی کہ ہم اپنی اقدار سے گہری عقیدت بھی رکھیں اور ان پر معروضی طور سے غور بھی کر سکیں ہم اپنی بنیادی اقدار کی خارجی تشکیل کے لیے جتنے زیادہ جاندار اور نئے سے نئے طریقے سوچیں گے ان سے ہماری قومی زندگی کو بھی اتنا ہی استحکام ملے گا۔ یورپ میں آزادی ہے مگر انصاف نہیں اور روس میں انصاف ہے مگر آزادی نہیں۔ ہندوستان میں دونوں چیزوں کی خیر نہیں دکھائی دیتی پاکستان نیا نیا ملک ہے ہمارے سیاسی، معاشی اور تہذیبی اداروں نے بھی ابھی کوئی ایسی شکل اختیار نہیں کی جسے بدلنا مشکل ہو اس کے ساتھ ساتھ ہماری پشت پر اسلام کی تیرہ سو سالہ تاریخ موجود ہے جس میں انصاف کی بھی بڑی جاندار روایت ملتی ہے اور آزادی کی بھی چنانچہ پاکستان میں ہم ایک زبردست تجربہ کر سکتے ہیں اور تجربہ ایسا ہو گا جو ہمیں اسلام کے مطالبات سے قریب لے آئے گا اگر ہم نے انصاف اور آزادی کو ایک جگہ جمع کر دیا تو یہ بیسویں صدی کا سب سے بڑا کارنامہ ہو گا اور انسانی تاریخ ہماری زیر بار احسان رہے ہمیں اپنی قوم اور اپنی روایت کی صلاحیتوں کو سمجھنا چاہیے۔“ [۶]

عسکری صاحب کو پورا یقین ہے کہ جہاں شخصیت پرستی یا خود پرستی کام کے لیے نقصان دہ ہے وہاں بے جا انکسار بھی ہماری جوان قوم کے لیے مہلک ثابت ہو گا۔ اگر ہم تخیل اور ہمت سے کام لیں تو ہمارے روایت اور تاریخ دونوں کا تقاضا ہے کہ یہ کام صرف ہم ہی کر سکتے ہیں عسکری صاحب محسوس کرتے ہیں کہ نہ یورپ نہ روس ایسا کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ پاکستان ضرور کامیاب ہو سکتا ہے اگر ہم ایسی ذہنیت سے رہائی حاصل کر سکیں جو خیالات کے تنوع سے ڈرتی ہے۔

اب ذرا ان عناصر پر ایک نظر تو کر لیں جنہیں عسکری صاحب پاکستان کے قومی کلچر کے بنیادی عناصر قرار دیتے ہیں۔

- ۱۔ اسلام
- ۲۔ ہندو اسلامی کلچر کی روایت
- ۳۔ مقامی کلچر [۷]

عسکری صاحب کا کہنا ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو پوری انسانیت کے مشترکہ کلچر کا حقدار ٹھہرایا ہے اور اگر ہم اس تعصب برتیں گے تو یہ خود اسلام کی روح کے منافی ہو گا۔ اس لیے ہم اپنے قومی کلچر کو دوسری قوموں کے کلچر سے اور پوری انسانیت کے مشترکہ کلچر سے الگ نہیں رکھ سکتے ہمارے یہاں کے بڑے پڑھے لکھے لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اب ہمیں یورپ کے کلچر اور ادب سے کیا واسطہ مگر یورپ کی سائنس پڑھنے کے بعد وہاں کے کلچر کا مطالعہ نہ کرنے کا مطلب بیسویں صدی میں یہ ہو گا کہ ہم اپنے کلچر کے لیے گڑھا کھود رہے ہیں یہ درست ہے کہ اس کلچر میں بہت برائیاں ہیں تو کم سے کم ان برائیوں سے واقف ہونے کے لیے ہیں مغربی کلچر کا مطالعہ ضروری بنتا ہے۔

ان باتوں پر عسکری صاحب کا کہنا ہے کہ موضوع کا ایک اور وہ توا نھوں نے پیش کر دیا ہے اب ملک کے جید علماء ادیب اس موضوع پر بات کریں تاکہ قومی کلچر جیسے نہایت اہم معاملہ پر سارے پہلوؤں سے بات ہو سکے۔ لیکن عسکری صاحب اپنی طرف سے پورے عین الیقین سے یہ باتیں دہراتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ

پاکستان کی بنیاد نہ رنگ پر ہے نہ نسل پر نہ جغرافیائی حدود پر اعداد و شمار پر اس کی بنیاد تو صرف ایک بات پر ہے اور وہ ہے ہندوستان بھر کے مسلمانوں کے مشترکہ قومیت کا احساس کیونکہ پاکستان کا خواب صرف پاکستان کے علاقوں میں رہنے والے مسلمانوں ہی نے نہیں بلکہ پورے براعظم ہند کے مسلمانوں نے دیکھا تھا۔ آپ سب نے دیکھا تھا کہ جب مدارس کے آقا پوپ کے مسلمانوں نے یہی تو نہیں سوچا کہ ہم سے پاکستان کتنا دور ہے یا ان کی زبان ہماری بول چال کی زبان سے مختلف ہے۔ نہ یہ سوچا کہ اس سے ہمیں فائدہ کیا ملنے والا ہے ان سب باتوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے براعظم ہندوستان کے مسلمانوں نے متفقہ فیصلہ کیا کہ ہمیں پاکستان چاہیے چاہے اس سے ہمیں فائدہ ہو یا نہ ہو کہتے ہیں آخر کوئی چیز تو تھی جس کے لیے مسلمانوں نے اپنے مستقبل کی بازی لگادی اس ضمن میں آپ کا ایک مضمون پاکستان کا تہذیبی مستقبل سے ایک پیرا گراف مقتبس کیے دیتے ہیں:

”ایک ایسی چیز تھی جو گروہوں اور خطوں کے انفرادی وجود اور انفرادی مستقبل سے کہیں بڑی تھی اور وہ چیز تھی ملی وحدت کا احساس یہ احساس اتنا کوئی تھا کہ نہ تو رنگ آڑے آیا نہ نسل یا وطن یہ احساس اتنا جاندار تھا کہ انسان کی فطری خود غرضی پر بھی غالب آگیا اور مسلمانوں نے ہر قسم کے فوری یا آئندہ خطروں سے بے نیاز ہو کر پاکستان کی حمایت کی اور یہ احساس اتنا جاندار کیوں نہ ہوتا؟ آخر ہندوستانی مسلمانوں کے پس منظر میں ۷۰ سال کی مشترکہ تاریخ تھی۔ مشترکہ روایات تھیں مشترکہ مذہب تھا آج تک سب کا مرنا جینا ایک تھا چاہے آپس میں کتنے ہی جھگڑے رہے ہوں۔ کتنی ہی گروہ بندیاں آرہی ہوں مگر پورے براعظم کے مسلمانوں کو احساس تھا کہ ہمارا ایک مرکز ہے ہماری تہذیب جداگانہ اور معین حیثیت رکھتی ہے۔“ [۸]

عسکری کے خیال میں کچھ لوگ ہیں جو قوم کو ڈرا رہے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ خلافت راشدہ کے ساتھ ساتھ اصلی اسلام بھی ختم ہو گیا اس طرح تو یہ لوگ اسلام کو ایک چھوٹی سی چیز بنا دینا چاہتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اگر خلافت کے بعد مسلمانوں میں بے راہ روی آگئی تو یہ تعجب کی بات نہیں۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ہزار خرابیوں کے باوجود مسلمان آج تک زندہ ہے اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ بے راہ روی کے باوجود مسلمانوں نے

لاکھوں لوگوں کو تخلیق کی راہ پر ڈالا۔ اور تعجب کی بات تو یہ بھی ہے کہ مطلق العنان بادشاہی کے باوجود اسلام کی بنیادی جمہوریت کو جہاں موقع ملا چمک اٹھی۔ اسلام کو مسلمانوں کی تاریخ سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور اسلام نے خیال اور عمل کو ایک کر دیا تو کیسے اسلام جیسی زندہ حقیقت کو محض ایک عقیدت کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

عسکری صاحب کا اصرار ہے کہ ہمیں بحیثیت مسلم قوم مسلمانوں کو تیرہ سو سالہ تاریخ کو اپنا ناہو گا۔ اپنی قوم کے اجتماعی تجربے سے فائدہ اٹھانا ہو گا اس سارے عرصے میں ہماری قوم بنی بھی ہیں بگڑی بھی ہے ہنسی بھی ہے روئی بھی ہے پاکباز بھی تو ہمیں ان ساری چیزوں کے اثر کو جذب کرنا ہو گا ہم اس اثر سے چاہتے ہوئے بھی پیچھا نہیں چھڑا سکتے اسی وجہ سے وہ عمر بن عبدالعزیز کی اچھائیوں کا بھی اپنا سمجھتے ہیں اور واجد علی شاہ اور محمد شاہ رگلیا کی برائیاں بھی ہماری تاریخ کا حصہ ہیں اسی تاریخ کے کسی دور کو ہم اچھا برا تو کہہ سکتے ہیں لیکن اس سے اپنا واسطہ راستہ جدا نہیں کر سکتے اس لیے اگر پاکستان کو ایک عظیم الشان ملک بنانا ہے تو ہر پاکستانی کو اپنی پوری تاریخ کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھانا ہو گا:

”اس وقت پاکستانیوں کے سامنے جو سب سے بڑا ذہنی مسئلہ ہے وہ مسلمانوں کی تیرہ سو سالہ تاریخ کو اپنے شعور میں رچانے کا ہے ہمارے سینکڑوں سوالوں کا جواب اسی ایک چیز میں ملے گا ہمیں اپنی تاریخ کو از سر نو سمجھنا ہے اور اپنی قومی زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی باتوں میں اسے اپنا راہنما بنانا ہے مسلمانوں نے اپنی بنیادی اقدار کو پیش نظر رکھا یوں میں یہ سوچنے کے لیے کبھی نہیں رکے کہ فلاں چیز ہماری ہے یا غیروں کی۔ انھیں جہاں سے بھی خام مواد ملا بے کھٹکے لیا اور اس سے اپنی مرضی کے مطابق چیزیں بنائیں انھوں نے یونانیوں سے سیکھا ایرانیوں سے سیکھا ہندوؤں سے سیکھا ہر ایک سے سیکھا مگر آخر میں ان کی انفرادیت ہر جگہ ابھر آئی۔ اس طرح وہ انسان کی نفسیات سے بھی نہیں ڈرے جنس کا نام آتے ہی ان کا وضو نہیں ٹوٹا سعدی نے پکڑ سے بھی گریز نہیں کیا مگر پھر بھی رحمہ اللہ علیہ بنے رہے۔ مسلمانوں نے ڈرنا اس وقت سیکھا جب تخلیق کی لہر کمزور پڑ گئی۔“ [۹]

پاکستان بننے کے قریباً ایک سال تک عسکری صاحب کا خصوصیت کے ساتھ اصرار رہا ہے کہ ادبی تقاضوں میں بھی ملکی مفاد میں بدل جانا چاہیے اس پر ترقی پسندوں سے اختلافات بھی بڑے واضح نظر آئے ہیں۔ عسکری صاحب کا کہنا ہے کہ اس وقت پاکستان دشمنوں کے زعمے میں ہے پہلے اس کی بنیاد ہی مضبوط کرنے کی فکر ہونی چاہیے۔ اب جب پاکستان مظلوم ہے ایسے میں غیر جانبداری کے معنی یہ نہیں کہ ظلم کے خلاف بات نہ کی جائے۔ مظلوم کا ساتھ نہ دیا جائے۔ اعلیٰ معیار اور یقیناً قابل اعتناء ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان بنیادی طور پر بڑا خود غرض واقع ہوا ہے اور وہ اپنے مفاد کے سامنے بڑے سے بڑے ادب کی بھی کوئی حیثیت نہیں سمجھتا کیوں کہ انسان کی آخری اور سب سے ضروری قدر بقا کی ضرورت ہے۔ جب اسے اپنی بقاء کا خطرہ محسوس ہوتا ہے تو وہ ہر چیز کو چھوڑ سکتا ہے۔ اپنے بچاؤ پر ہر چیز قربان کر سکتا ہے یہ بات بجائے خود غلط اور افسوسناک ہے لیکن فطرت کو بدلنا بھی کسی کے اختیار میں نہیں۔ اس صورتحال میں عسکری صاحب ترقی پسند جماعت ان کے نمائندوں اور حتیٰ کہ حکومت پاکستان کو برا بھلا کہنے سے نہیں چوکتے ایک اقتباس اس ضمن میں نقل کیا جاتا ہے:

”سجاد ظہیر صاحب اپنے اخبار میں روز پاکستان کے خلاف ہرزہ سرائیاں کرتے ہیں اور پاکستان کے لوگوں کو ہر طرح سے حکومت کے خلاف بدظن کرنے کی آئے دن کوششیں کرتے ہیں لیکن انھوں نے لاہور آ کے مزے سے ترقی پسندوں کی کانفرنس کا افتتاح ریلوے مزدوروں کی ہڑتال کرائی اور کسی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ میاں تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں پاکستان میں تو حکومت نے ایسی رسی ڈھیلی چھوڑی ہے کہ جس کے گلے میں جوتان آتی ہے اڑتا ہے۔ بلکہ حکومت کی خاموشی تو اس اب غفلت کی حد کو پہنچ گئی ہے۔ اگر روس میں ایسی ترقی پسندانہ حرکتیں کرتے تو اب تک بہت سے ادیب چومینہ کر کے چھوڑ دیے گئے ہوتے وہ تو بھلے کو پاکستان ہے۔“ [۱۰]

ترقی پسندوں کے ساتھ ساتھ عسکری صاحب ”اسلامی ادب“ کے حامیوں کو بھی اپنی سوچ کو تنگ نظری، دنیائوسی اور انتہا پسندی سے دور رکھنے کی ترغیب دیتے ہیں اور اگر ہم نے ”خالص“ اسلامی ادب پر

ضرورت سے زیادہ زور دیا تو ادب بھی ختم ہو کے رہ جائے گا۔ اسی وجہ سے تو ترقی پسندوں کے ہاتھوں ادب کی خرابی پیدا ہوئی ان کے ہاں بھی ادب سیاسی فارمولوں میں تبدیل ہو کے رہ گیا وہ لکھتے ہیں:

”اگر اسلامی ادب کے علمبرداروں نے بھی اسی تاریخ کو دوہرایا تو بڑی اندوہناک بات ہوگی مگر میں دیکھتا ہوں کہ بعض حضرات اسلامی ادب کے نام کو تخلیقی تحریک کی حیثیت سے نہیں بلکہ مختب کے کوڑے کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ غرض جو صاحب اسلامی ادب لکھنا یا پڑھنا چاہتے ہوں انھیں پہلے تو اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ دینا چاہیے دودو منٹ کے بعد لال پیلے ہونے سے کسی قسم کا بھی ادب پیدا نہیں ہوگا۔ اسلامی ادب منہ کا نوالہ نہیں ہے۔ اسے پوری بیسویں صدی کو اپنے اندر سمیٹنا ہوگا۔ یہ کام ہلڑ بازی سے نہیں ہوگا، اس سے تو فنکار کی شخصیت ہی نمٹ سکتی ہے ادیبوں کو اسلامی ادب کی طرف بلانے کا طریقہ بھی یہ نہیں ہے کہ تخلیقی کام سے پہلے احتسابی کام شروع کیا جائے اور ادب کو سیاست بنادیا جائے۔“ [۱۱]

عسکری صاحب کو ان ساری باتوں کا ماحصل ہم ان دو باتوں سے ظاہر کر سکتے ہیں ایک تو یہ کہ ادیبوں کا حق انفرادیت برقرار رہے، انھیں آزاد اظہار خیال کے ذریعے اردو ادب میں نئی بہاریں لانے کا پورا حق ہے۔ وہ ادب کے مسلمہ بنیادی اصول کے مطابق عقائد اور اقدار کے کھوکھلے پن کو بھی آزادی سے بے نقاب کر سکتے ہیں۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد حالات کا تقاضا یہ ہے کہ اس عمل میں پاکستانی قوم کے بنیادی عقائد و اقدار کا احترام ملحوظ خاطر رکھا جائے اور دوسری یہ کہ قدیم اردو ادب روایات کو نئی تعمیر میں ضرور شامل کرنا چاہیے لیکن ادب کی نئی زندگی متقاضی ہے کہ صرف ان زندہ روایات کو لیا جائے جو آزاد پاکستان کا عظیم ادب پیدا کرنے میں کام دے سکیں۔

عسکری صاحب کا ترقی پسندوں پر غصہ ہونے کا ایک جواز بھی تھا کہ تقسیم ہند کے تھوڑے ہی ہفتوں بعد جب ہندوستان نے کشمیر پر حملہ کر دیا اور دسمبر ۱۹۴۷ء میں چند ہندوستانی ادیبوں نے حکومت ہند کی کشمیر پالیسی کی حمایت میں ایک بیان جاری کیا تھا۔ یہاں محمد حسن عسکری اور غلام عباس کا خیال تھا کہ پاکستانی ادیبوں کو بھی

اپنی حکومت کے ساتھ کھڑا ہونا چاہیے اور اس کے موقف کی تائید میں ایک بیان جاری کرنا چاہیے۔ پھر یہ بیان جنوری ۱۹۴۸ء کے پاکستان ٹائمز میں چھپا۔ جس پر فیض احمد فیض کے علاوہ کسی ایک ترقی پسند ادیب نے بھی دستخط نہ کیے۔ [۱۲]

یہ بات عسکری صاحب کے لیے ناقابل قبول تھی اس پر عسکری صاحب نے ترقی پسندوں کو بہت مطعون ٹھہرایا۔ جماعت کے نام اور پھر ادیبوں کے نام لے لے کر انھیں اس اقدام پر بہت برا بھلا سنا یا۔ یہی سبب ہے کہ عسکری سے اختلافی نقطہ نظر رکھنے والوں میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیب پیش پیش رہے ہیں۔ عسکری صاحب سے سب سے زیادہ اختلاف اس وقت سامنے آیا جب قیام پاکستان کے وقت، سبھی اہل فسادات کے موضوع پر اظہار خیال میں مصروف تھے اور ادھر عسکری صاحب نے پاکستانی ادب کی بحث کا آغاز کر دیا جو بعد میں اسلامی ادب کے نام سے بھی جانی گئی۔ یہ نام لینا تھا کہ ترقی پسند اور لبرل ادیب ایک دم سے چھلانگ لگا کر اس بحث میں کود پڑے اور عسکری صاحب کے خلاف مضامین کا سلسلہ شروع ہوا۔ مجموعی طور پر مذہب اور بالخصوص اسلام، کچھ لوگوں کا ایسا مسئلہ رہا ہے کہ وہ جب بھی یہ نام سنتے ہیں، ان سے رہا نہیں جاتا وہ مخالفت کرنا ضروری تصور کرتے ہیں اور پھر عسکری صاحب کی حیثیت بھی ترقی پسندوں کے لیے کچھ ایسی تھی کہ وہ جو کچھ بھی کہیں گے اس کی مخالفت ترقی پسند مصنفین پر فرض بنے گی۔ عسکری صاحب کے پاکستانی/اسلامی ادب کے بارے میں بھی یہی کچھ ہوا لیکن یہ کسی نے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کہ عسکری صاحب اور خالص مذہبی جماعتوں کے موقف میں ایک واضح اور بنیادی فرق ہے۔ عسکری نے اسلامی تہذیب اور کلچر کے حوالے سے بار بار یہ کہا ہے کہ مسلم کلچر دنیا کا مضبوط کلچر ہے، وہ دوسری تہذیبوں اور ثقافتوں کے ساتھ مل کر بھی اپنا تشخص برقرار رکھنے میں کامیاب رہا ہے۔ وہ دوسری ثقافتوں کے اثرات لے کر خود کو بہتر کرتا ہے اور اس بنا پر وہ ہندو کلچر کی اچھی باتیں لینے کے حق میں ہیں اور ہندو اسلامی تہذیب کو پاکستان کی تہذیب قرار دیتے ہیں۔ عسکری صاحب ہندوستان کی اسلامی تاریخ کو خوبیوں اور خامیوں سمیت اپنی تاریخ ماننے پر زور دیتے رہے ہیں۔ وہ تہذیب کے اجزاء اور ٹکڑوں میں پسند کرنے کے خواہاں نہیں ہیں۔ وہ پوری تیرہ سو سالہ اسلامی

تاریخ کو اپناتے ہیں، وہ خود کو خلافت راشدہ اور عمر بن عبدالعزیز کا جانشین ہی نہیں بل کہ واجد علی شاہ اور محمد شاہ رگھیلہ کا بھی جانشین تصور کرتے ہیں۔ اس کی تفصیلات دوسرے باب میں گزر چکی ہیں۔ لیکن خالص مذہبی نقطہ نظر جسے ادب اسلامی کے دوستوں نے پیش کیا ہے وہ یقیناً عسکری صاحب کے نقطہ نظر کے مقابلے میں تنگ نظری اور تعصب کا مظاہرہ کرتا ہے جس کا فرق جاننے کے لیے ہم مودودی صاحب کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں کہ جسے بنیاد بنا کر ترقی پسند ادیبوں نے عسکری صاحب کی مخالفتوں میں کوئی انتہا نہ چھوڑی، مودودی صاحب کی اس تحریر سے بنیاد پرست مذہبی حلقے متفق ہیں:

”اس غلط فہمی نے بنیادی طور پر اپنی تہذیب، اپنے تمدن اور اپنی تاریخ کے متعلق آپ کے رویہ کو غلط کر دیا ہے۔ جو بادشاہتیں یا حکومتیں غیر اسلامی اصولوں پر قائم ہوئی تھیں، آپ ان کو اسلامی حکومتیں کہتے ہیں۔ محض اس لیے کہ ان کے تحت نشین مسلمان تھے۔ جو تمدن قرطبہ و بغداد اور دہلی و قاہرہ کے عیش پرست درباریوں میں پرورش پایا تھا، اسے آپ اسلامی تمدن کہتے ہیں۔ حالاں کہ اسلام کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ آپ سے جب اسلامی تہذیب کے متعلق سوال کیا جاتا ہے تو آپ جھٹ سے آگرے کے تاج محل کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ گویا یہ ہے اسلامی تہذیب کا سب سے نمایاں نمونہ حالاں کہ اسلامی تہذیب کے مفاخر بیان کرنے آتے ہیں تو عباسیوں، سلجوقیوں اور مغلوں کے کارنامے بیان کرتے ہیں حالاں کہ حقیقی اسلامی تاریخ کے نقطہ نظر سے ان کارناموں کا بڑا حصہ آپ زرسے نہیں بل کہ سیاہ روشنائی سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ آپ کے زاویہ نظر میں یہ کبھی صرف اس لیے پیدا ہوئی کہ آپ مسلمان کی ہر چیز کو اسلامی سمجھتے ہیں اور آپ کا گمان یہ ہے کہ جو شخص مسلمان کہلاتا ہے وہ اگر غیر مسلمانہ طریق پر بھی کام کرے تو اس کے کام کو مسلمانوں کا کام سمجھا جائے۔“ [۱۳]

یہ نقطہ نظر بنیاد پرست مذہبی جماعتوں کا متفقہ موقف سمجھا جاسکتا ہے اس کی توسیع میں ماہر القادری، نعیم صدیقی اور محمد عثمان نے بہت کچھ لکھا بھی ہے لیکن بنیادی طور پر یہ بیانیہ بھی عسکری صاحب کے مخالف ہی رہا۔ اور دوسری طرف ترقی پسند تحریک کے معتدل ادیب مثلاً فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی نے بھی کلچر اور

پاکستان کی تہذیب اور دوسرے ادبی مسائل پر مخلصانہ اظہار خیال کیا۔ اگرچہ وہ بھی عسکری کے پاکستانی کلچر کے بارے خیالات سے اختلاف رکھتے ہیں مگر ان کا ماننا ہے:

”پاکستان کی قومی تہذیب پاکستان کی تہذیب ہے، یعنی اس قوم کے امتیازی نشانات کیا ہیں جو اس کو دوسری قوموں سے ممیز کرتے ہیں۔ ایک تمیز تو اس کے نام سے ہی ظاہر ہے۔ پاکستانی قوم کی دو امتیازی خصوصیات ہیں ایک یہ کہ وہ پاکستانی ہیں۔ دوسری یہ کہ اس کی اکثریت مسلمان ہے تو گویا دو ترکیبی عناصر ہوئے آپ کی قومیت کے، جس میں سے ایک کو تو پاکستانیت کہیے اور دوسرے کو اسلامیت یا مسلمیت۔“ [۱۴]

عام طور پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیبوں کو لادین، ملحد اور کسی اخلاقی اقدار سے ماورا سمجھا جاتا ہے۔ سیکولر ازم کا نام بھی اسی زمرے میں شمار کیا جاتا ہے لیکن سبب حسن مذہب کو اس کی پوری اہمیت دیتے ہیں اور معاشرتی نظام میں سیکولر ازم کے نفاذ کو کسی دین بالخصوص اسلام کے متصادم نہیں سمجھتے۔ ان کا کہنا ہے کہ سیکولر ازم کو معاشرتی نظام کے لیے درست سمجھنے سے نہ ایک دین دار بے دین ہو جاتا ہے اور نہ ایک خدا پرست دہریہ بن جاتا ہے لہذا سیکولر ازم سے نہ تو اسلام کو کوئی خطرہ ہے اور نہ ہی پاکستان کی بقا اور سالمیت کو کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے بل کہ وہ یہ سمجھتے ہیں:

”سیکولر اصولوں پر چل کر پاکستان ایک روشن خیال، ترقی یافتہ اور خوشحال ملک بن سکتا ہے۔ سیکولر ازم کا مقصد معاشرے کی صحت مند سماجی اور اخلاقی قدروں کو پامال کرنا نہیں ہے بل کہ سیکولر ازم ایک ایسا فلسفہ حیات ہے جو خرد مندی اور شخصی آزادی کی تعلیم دیتا ہے اور تقلید پرستی کے بجائے عقل و علم کی اجتہادی قوتوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ چنانچہ سیکولر ازم کی تبلیغ کرنے والوں کی برابر یہی کوشش رہی ہے کہ انسان کے عمل و فکر کو توہمات کے جال سے نکالا جائے۔ یہ کوئی انوکھا فلسفہ نہیں ہے۔ ہمارے صوفیا کرام بھی یہی کہتے تھے کہ سچائی کو خود تلاش کرو، خود پہچانو اور جو رشتہ بھی قائم کرو خواہ وہ خالق سے ہو یہ مخلوق سے معرفت حق پر مبنی ہو نہ کہ انعام کے لالچ اور سزا کے خوف پر۔“ [۱۵]

سید سبط حسن نے عسکری صاحب کے تصورات سے اختلاف کیے ہیں لیکن وہ کبھی بھی عسکری صاحب کی ادبی اہمیت سے انکاری نہیں ہوئے۔ ہاں یوں بھی ہوا ہے کہ وہ عسکری صاحب پر بات کرتے ہوئے طنز و تشنیع سے کام لیتے رہے کبھی یہ کہہ کر کہ ترقی پسند ادب کی مخالفت شروع کی اور تصوف کی جانب مائل ہو گئے اور ”نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مصنف ’ہبشتی زیور‘ اور مفتی محمد شفیع کے گن گانے لگے۔“ یا پھر کبھی یوں رقم طراز ہوئے کہ عسکری صاحب کی جرات لائق داد ہے کہ انھوں نے مغرب کی ڈھائی ہزار برس کی طویل مدت پر پھیلی ہوئی انگریزوں کا محاکمہ اسی پچاس صفحوں میں لکھ ڈالا اور افلاطون سے آئن سٹائن تک کی گراہیوں کی نشان دہی کر دی۔^[۱۶]

سبط حسن نے عسکری صاحب کی ”جدیدیت یا مغربی گراہیوں کی تاریخ کا خاکہ“ پر مفصل گفتگو کی ہے اور عسکری صاحب کے بیش تر خیالات سے اختلاف کرتے ہوئے پائے گئے ہیں ان کا کہنا ہے کہ عسکری صاحب مسلمانوں کو یونانی اور رومی فکر سے بچنے کی تاکید کے ساتھ ساتھ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے دور میں رائج ہونے والے سائنسی اور فلسفیانہ نظریات سے بھی پرہیز کا مشورہ دیتے ہیں جسے سبط حسن عسکری کی غلط سوچ کا نتیجہ تصور کرتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں اٹھارویں صدی کی خرد افروزی کی تحریک جو صنعتی انقلاب اور جمہوریت کا پیش خیمہ تھی، وہ بھی عسکری صاحب کی لعن و طعن سے نہیں بچ سکی۔ عسکری صاحب کے ان تصورات کا خلاصہ کرتے ہوئے سبط حسن صاحب کچھ یوں رقم طراز ہیں:

”عسکری صاحب نے مغربی فکر کا تجزیہ مذہب کے حوالے سے کیا ہے۔ وہ عقلیت کے مخالف ہیں، مطالعہ فطرت کے خلاف ہیں، مشاہدے اور تجربے کی صداقت کے مخالف ہیں، ڈارون کے نظریہ ارتقا کے مخالف ہیں، نیوٹن کی کشش ثقل کے نظریے کے مخالف ہیں، اسپنسر کے نامیت کے مخالف ہیں، آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کے مخالف ہیں۔ البتہ وہ کوپر نیکس اور گلیلو کے گردش زمین کے نظریے کو نظر انداز کر گئے حالانکہ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہی نظریہ متذکرہ بالا تمام نظریوں کی انگریزوں کی جڑ ہے۔ معاشرتی امور

میں وہ قومیت کے مخالف ہیں۔ مغربی جمہوریت کے مخالف ہیں، کمیونزم کے مخالف ہیں، تاریخیت کے مخالف ہیں، ترقی کے مخالف ہیں۔“ [۱۷]

ممتاز حسین صاحب ترقی پسند تحریک کے سرکردہ ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں ممتاز حسین عسکری صاحب سے اصولی اختلاف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ممتاز حسین کہتے ہیں کہ یہ ادب برائے ادب تو محض ایک حربہ تھا دراصل وہ اس کے ذریعے رجعت پسند خیالات کی تبلیغ کرنا چاہتے تھے یوں انھوں نے اس حقیقت کو چھپانے کے لیے اس سے مدد لی اور اپنے اظہار کو زیادہ سے زیادہ مشکل بنانے کی بھی کوشش کی۔ اور ماضی پرستی میں وہ انسانوں کو غلام رکھنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آج جب کہ پورے کرہ ارض پر محکوم اور مظلوم انسانوں کی دنیا اپنی غلامی کی زنجیروں کو توڑنا چاہ رہی ہیں تو یہ رجعت پسند طاقتیں اپنے خوف ناک اور بھیانک ماضی کو بھی جگا رہی ہیں وہ لکھتے ہیں:

”یہ تمام رجعت پسند ادیب ماضی کی بھیانک روایات کو رجعت پسندی کی خدمات میں مجتمع کر رہے ہیں۔ یہ کام صرف یورپ ہی میں نہیں ہو رہا ہے بل کہ ہندوستان اور پاکستان میں بھی ہو رہا ہے۔ آج حسن عسکری اور اس کے رفقاء ادب برائے ادب کا نعرہ بلند نہیں کر رہے بل کہ انسان کو حیوان ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسے ماحول پر قابو پانے والا حیوان مطلق بنا کر اسے جذبہ عبدیت میں غرق کرنا چاہتے ہیں۔ حسن عسکری نے انسان کی انزلی اور ابدی خصوصیت ظلم اور جہل بتلائی ہے ان دونوں میں رجعت پسندی کی پوری تفصیل چھپی ہوئی ہے۔ اسے جہل اختیار کرنا چاہیے تاکہ وہ انسانی عقل و شعور اور سائنس کی قدروں سے محروم ہو جائے۔ اسے ظلم کرنا چاہیے تاکہ وہ اپنے ملک کی ترقی پسند قوتوں پر حملہ کرے، اسے ظلم کرنا چاہیے تاکہ وہ ہمسایہ ملکوں پر حملہ کرے، اسے ظلم کرنا چاہیے تاکہ وہ تیسری جنگ عظیم میں ڈالر کی خدمت انجام دے سکے۔ ایسا کیوں ہے کہ آج قرون وسطیٰ کے تاریک فلسفوں نے سرمایہ داری کے رجعت پسند فلسفوں سے معائنہ کر لیا ہے۔“ [۱۸]

بنیادی طور پر قاسمی صاحب ترقی پسند تحریک کے سرگرم رکن رہے ہیں لیکن ترقی پسند تحریک کے شدت پسند ادیبوں کے برعکس اور فیض احمد فیض کی طرح وہ بھی معتدل رویہ اپنانے کے ساتھ پاکستان کو کھلے دل سے تسلیم کرتے ہیں اور اس کی مذہبی اساس کو بھی تسلیم کرتے ہیں جس کا اظہار بھی برملا کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں قاسمی صاحب اس بات کو کھلے دل سے تسلیم کرتے ہیں کہ ہم نے پاکستان اس لیے حاصل کیا کہ ہم ایک منفرد نظریہ حیات اور منفرد تہذیب کے حامل قوم ہیں۔ ان کے خیال میں تہذیب میں مذہب اور عقیدے کا بنیادی کردار ہوتا ہے لیکن وہ اپنی شناخت محض مسلمان کی حیثیت سے بھی نہیں کرنا چاہتے بل کہ اس میں پاکستانی غد و خال بھی نمایاں ہونا ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمیں نہ صرف انڈیا سے الگ اپنا ثقافتی وجود ثابت کرنا ہے بل کہ ہمیں دوسری مسلم دنیا سے بھی خود کو منفرد ثابت کرنا ہے۔^[۱۹] اس سلسلے میں وہ اپنی قومی تاریخ سے قومی کلچر کو منسلک سمجھتے ہیں۔ وہ خطے کی جغرافیائی اہمیت کے قائل ہیں اور اس طرح حسن عسکری کے تصورات سے خود کو مختلف بناتے ہیں۔ اگرچہ وہ کلچر کے اسلامی عنصر کو بھی ضروری مانتے ہیں لیکن وہ معلوم جغرافیائی تاریخ سے اپنے کلچر کے آغاز پر اصرار کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:

”ہمیں اس خطہ ارض کی معلوم تاریخ سے اپنے کلچر کا آغاز کرنے سے کیوں شرم آتی ہے جو آج پاکستان کہلاتا ہے اور جو پاکستان کہلانے سے پہلے ویرانہ نہ تھا بل کہ یہاں کتنی ہی تہذیبی ابھریں، پھیلیں، رکیں اور خاک ہو گئیں۔ پھر جب تہذیبیں مرتی ہیں تو اپنی بعض نشانیوں ضرور چھوڑ جاتی ہیں۔ انسانوں کی طرح جو مر کر اپنی اولاد کی شکل میں زندہ رہتے ہیں۔ ان تہذیبوں پر نئے عناصر اثر انداز ہوتے ہیں پھر یہ عناصر پرانے ہو کر جدید تر عناصر کی زد میں آ جاتے ہیں۔۔۔۔۔ کسی بھی ملک کی تہذیب کو لے لیجیے اس میں اس ملک کے قدیم ترین سے تہذیب کی جھلکیاں ضرور موجود ہوں گی۔۔۔۔۔ اس کلچر اور تہذیب کی مختلف شقوں کو اگر ہم نے محض اس لیے نظر انداز کرنا شروع کر دیا کہ یہ دو تین ہزار سال پہلے کی تہذیبوں سے یہاں تک منتقل ہوئی ہیں تو اس سے بڑا تہذیبی حادثہ ہو ہی نہیں سکتا۔“^[۲۰]

قاسمی صاحب محمد حسن عسکری کے ہندو اسلامی تہذیب کے تصور سے اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم تہذیبی اثرات کے قائل ہیں لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہماری اور ہندوستان کی تہذیب ایک ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ یہ درست ہے کہ ہندوستانی کلچر کے بعض پہلو ہمارے کلچر کی کچھ حصوں سے مماثل ہیں، تو اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہم سب عربوں، پٹھانوں، مغلوں اور انگریزوں سے یکساں طور پر متاثر ہوتے رہتے ہیں لیکن:

”غور کیجئے تو ان دونوں تمدنوں کے مماثل پہلو صرف وہی ہیں جو مسلمانوں کے دورِ اقتدار میں برصغیر کے عمومی کلچر کا حصہ بنے۔ ہمیں تو اس پر فخر کرنا چاہیے۔ چنانچہ جن عناصر کو ہندوستانی دانشوروں کے اس نعرے میں بڑی صداقت نظر آتی ہے کہ ہماری تہذیب تو بنیادی طور پر ایک ہے۔ انھوں نے دراصل اپنی تہذیبی انفرادیت اور اپنے وجود کے تاریخی جواز کا بغور مطالعہ نہیں فرمایا۔ تہذیبوں کے درمیان بعض مماثلتیں کہاں نہیں مگر ہندوستانی دانشوروں کی طرف سے یہ جو واحد تہذیب کا نعرہ مسلسل بلند ہو رہا ہے وہ فی الحقیقت ایک خطرناک سیاسی نعرہ ہے۔ جو اصحاب اس نعرے سے متاثر ہوتے ہیں۔ وہ (مجھے یقین ہے) غیر شعوری طور پر متاثر ہوتے ہیں اور یوں کابل بے خبری میں ہندوستانی سیاست کے آلہ کار بنتے ہیں۔ عدم وابستگی سے اگر مسئلہ کے بارے میں سوچا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ برصغیر میں شدید اختلاف یہاں کے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں رہا ہے اس کی مثال کسی حد تک صرف امریکہ کی گوری اور کالی آبادی کے تہذیبی اختلاف ہی میں مل سکتی ہے۔“ [۲]

انتظار حسین یوں تو عسکری صاحب سے پیش تر باتوں سے اتفاق کرنے والے ادیبوں میں ہیں۔ لیکن وہ اپنے لیے یہ واجب بھی نہیں ٹھہرا لیتے کہ جو نکتہ عسکری صاحب نے اٹھایا ہے اس پر قلم فرسائی کی جائے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ عسکری صاحب تو لمحوں میں اپنے آپ کو بدل لیتے تھے اپنے نظریات اور آرا کو بدل لینے کی ہمت رکھتے تھے۔ عسکری نے اپنی زندگی میں ایسی ایسی زقندیں لگائی ہیں کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ

انھوں نے سوویت روس کی وکالت اپنے ذمے لے لی تھی۔ انتظار حسین کے لیے ایسا ممکن نہ تھا۔ اور جب عسکری صاحب پاکستانی ادب اور اسلامی ادب کی باتیں کر رہے تھے تو انتظار حسین ان جھیلوں سے دور اپنی بستی کو دل میں بسائے رفتگاں کا سراغ لگانے کے لیے کہانیاں لکھنے میں محو تھے۔ وہ اپنے بکھرے ہوئے ماضی کو یک جا کرنے میں سرگرداں ہو کر ناصر کاظمی کا یہ شعر گنگنا تے نظر آتے ہیں:

مل ہی جائے گا رفتگاں کا سراغ
اور کچھ دن پھر و اداس اداس

لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ ”ہم اپنے باغ سے دور ہو گئے ہیں ماضی سے رشتہ استوار ہو تو ماضی کو یاد کرنا رسمی معاملہ ہے۔ رشتہ ٹوٹ جائے تو ماضی عہد کا مسئلہ بن جاتا ہے۔“^[۲۲] یوں انتظار حسین کا، اور اس کے عہد کا مسئلہ کچھ اور تھا اور عسکری صاحب جو جلد اپنے آپ کو تبدیل کرنے یا حالات سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے، ان کے لیے مسئلہ کچھ اور تھا، گو پاکستان ہجرت کرنے کے بعد کچھ عرصہ وہ بھی خاموش رہے لیکن جلد انھوں نے اپنے لیے راہیں متعین کر لیں، اور ”ساقی“ میں لکھنے لگے جس پر انتظار صاحب کا یہ پیرا گراف بڑا دل چسپ ہے جس میں عسکری اور انتظار صاحب کے مزاج کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے:

”پھر جب ”ساقی“ نکل آیا تو عسکری صاحب اپنی یہ بحث وہاں لے گئے جو پاکستان سے وفاداری کے سوال سے پاکستانی ادب کے سوال پر گئی پھر عسکری صاحب نے ایک اور زقند لگائی اور اسلامی ادب کا سوال کھڑا کر دیا۔ خیر عسکری صاحب کے زقندوں کا کیا پوچھو ہو۔ زقندیں تو انھوں نے ایسی ایسی بھریں کہ ایک وقت میں سوویت روس کی پالیسیوں کے سب سے بڑے وکیل وہی نظر آنے لگے۔“^[۲۳]

حواشی

- ۱۔ محمد حسن عسکری، ”پاکستان“، مضمون: مجموعہ محمد حسن عسکری (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص ۱۴۱: ۴۲۔
- ۲۔ عسکری صاحب کا یہ اقتباس، نظیر صدیقی کے مضمون ’پروفیسر حسن عسکری‘ سے نقل کیا ہے جو کہ اشتیاق احمد کی مرتبہ: محمد حسن عسکری ایک عہد آفریں نقاد، کے صفحہ ۶۹ میں دیکھا جاسکتا ہے۔
- ۳۔ محمد حسن عسکری، ”پاکستانی ادب“، مضمون: مجموعہ محمد حسن عسکری، ص ۱۱۴۶۔
- ۴۔ محمد حسن عسکری، مقالات محمد حسن عسکری، ج ۲، مرتبہ: شیماجید (لاہور: علم و عرفان پبلشرز، ۲۰۰۱ء)، ص ۴۸۔
- ۵۔ ایضاً، ص ۴۹۔
- ۶۔ ایضاً، ص ۵۵۔
- ۷۔ ایضاً، ص ۵۶۔
- ۸۔ ایضاً، ص ۶۲۔
- ۹۔ محمد حسن عسکری، ”تاریخی شعور“، مضمون: عسکری نامہ (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء)، ص ۶۷۔
- ۱۰۔ محمد حسن عسکری، ”مسلمان اور ترقی پسندی“، مضمون: مقالات محمد حسن عسکری، ج ۱، مرتبہ: شیماجید (لاہور: علم و عرفان پبلشرز، ۲۰۰۱ء)، ص ۶۹۔
- ۱۱۔ محمد حسن عسکری، ”پاکستانی قوم ادب اور ادیب“، مضمون: عسکری نامہ، ص ۳۱۷۔
- ۱۲۔ عزیز ابن الحسن، محمد حسن عسکری، شخصیت اور فن (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۷ء)، ص ۲۳۔
- ۱۳۔ ابوالاعلیٰ مودودی، مسئلہ قومیت (لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۷۸ء)، ص ۱۸۶: ۱۸۷۔

- ۱۴۔ فیض احمد فیض، پاکستانی کلچر اور قومی تشخص کی تلاش، مرتبہ: شیماجید (لاہور: فیروز سنز، ۱۹۸۸ء)، ص ۲۸۔
- ۱۵۔ سبط حسن، ”سیکولرازم“، مشمولہ: نوید فکر (کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۲ء)، ص ۷۱۔
- ۱۶۔ سبط حسن، ”عسکری صاحب کی جدیدیت“، مشمولہ: افکار تازہ، مرتبہ: ڈاکٹر سید جعفر احمد (کراچی: مکتبہ دانیال، تیسری بار، ۲۰۰۹ء)، ص ۲۱۵۔
- ۱۷۔ ایضاً، ص ۲۱۶: ۲۱۷۔
- ۱۸۔ ممتاز حسین، ”رجعت پسند ادب کیا ہے“، مشمولہ: فنّی تنقیدی گوشے (دہلی: آزاد کتاب گھر، کلاں محل، ۱۹۶۴ء)، ص ۳۶: ۳۵۔
- ۱۹۔ غلام عباس، ڈاکٹر، اردو تنقید اور پاکستانی کلچر کے مسائل (سرگودھا: شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف سرگودھا، ۲۰۱۷ء)، ص ۹۰۔
- ۲۰۔ احمد ندیم قاسمی، ”پاکستانی ثقافت“، مشمولہ: نیرنگ خیال (ماہ نامہ)، سال نامہ ۱۹۸۶ء، راول پنڈی، ص ۳۸۔
- ۲۱۔ احمد ندیم قاسمی، ”پاکستانی تہذیب کی صورت پذیری“، مشمولہ: کلچر، مرتبہ: اشتیاق احمد، ص ۱۱۳۔
- ۲۲۔ انتظار حسین، ”نیا ادب اور پرانی کہانیاں“، مشمولہ: علامتوں کا زوال (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء)، ص ۳۵۔
- ۲۳۔ انتظار حسین، چراغوں کا دھواں (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، طبع سوم، ۲۰۱۲ء)، ص ۳۶۔